باب نہم

افغانستان، افغانستان

جون 1979ء میں ٹھیک ان دنوں جب جنرل اختر عبدالرحمٰن کو آئی ایس آئی کا سربراہ مقرر کیا گیا، صدر ضیاالحق نے امریکہ کے صدر جمی کارٹر کو 12 صفحے کا ایک خط لکھا، جس میں افغانستان کی صورتحال اور تیزی سے پھیلتی ہوئی عوامی بغاوت پر تفصیل سے روشنی ڈالنے کے بعد یہ پیش گوئی کی گئی تھی کہ سوویت یونین اپنے کٹھ پتلی حکومت کو بچانے کے لیے افغانستان میں مسلح مداخلت کرسکتا ہے۔ صدر جمی کارٹر نے اس خط کا سرے سے کوئی جواب نہ دیا۔ امریکی صدر ضیاالحق سے ناراض تھے اور اس کی تصدیق اس وقت ہوگئی جب آئی ایس آئی نے اسلام آباد میں امریکی سفارت خانے کے نام بھیجے جانے والے ایک پیغام کا سراغ لگایا، جس میں صدر کی مخالف طاقتوں کی مدد کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ اس شخص کو جس نے اپنی انتخابی مہم کی بنیاد دنیا میں بنیادی حقوق کی حفاظت کے نعرے پر اٹھائی تھی، افغانستان میں انسانوں کے قتل عام پر تو کوئی تشویش نہیں تھی، لیکن پاکستان میں سیاسی پابندیوں پر وہ بہت پریشان تھا۔ اس کی انتظامیہ اور لمبے بازووں والی سی آئی اے کو کچھ معلوم نہ تھا کہ افغانستان میں کیا ہونے والا ہے۔ جہاں نیم پاگل حفیظ اللہ امین کی سپاہ انسانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہی تھی اور ان گنت لوگوں کو عقوبت خانوں میں بند کردیا گیا تھا۔

27 دسمبر 1979ء کو روسی افغانستان میں داخل ہوگئے۔ انہوں نے حفیظ اللہ امین کو قتل کرڈالا، جو ان کے خیال میں کمیونسٹ پارٹی کو تباہ کررہا تھا اور بغاوت کو کچلنے کا اہل نہ تھا۔ ان کے دیوہیکل ٹرانسپورٹ طیارے اسلحہ لے کر کابل کے ہوائی اڈے پر اترنے لگے، شہر پر بمبار جہاز پرواز کرنے لگے، اور شاہراہ سالانگ کے راستے سرخ فوج کے دستے کابل کی طرف بڑھنے لگے۔ ببرک کارمل نے جو شاہی محالات میں پروان چڑھا تھا، روس کے پنج شنبہ ریڈیو سٹیشن سے پہلی بار قوم سے خطاب کیا۔ اسے غیر ملکیوں نے اپنی قوم کا آقا بنا دیا تھا۔ اب ایک نیا اور زیادہ بھیانک خطرہ پاکستان کی سرحدوں پر دستک دے رہا تھا۔

بنگلہ دیش کے صدر ضیاالرحمٰن کے ساتھ مشورے کے بعد صدر ضیاالحق نے دفتر خارجہ کو اسلام آباد میں اسلامی سربراہ کانفرنس کے وزرائے خارجہ کا اجلاس بلانے کے لیے کہا۔ کانفرنس کی تیاریوں کے دوران دارالحکومت میں بلائے گئے اخبار نویسوں میں سے ایک نے، جو صدر سے قدرے بے تکلفی رکھتا تھا، سوال کیا کہ کیا دنیا پاکستان کی مدد کو آئے گی۔ اس یقین کے ساتھ جو کبھی اس آدمی سے جدا نہیں ہوا تھا، اور جس نے بدترین حالات میں اسے سنبھالے رکھا، انہوں نے کہا، دنیا کمزور اور تنہا لوگوں کی مدد نہیں کرتی، لیکن ہمیں حالات کا مقابلہ کرنا ہے، اور جب ہم کچھ کر دکھائیں گے، تو دنیا والے بھی آ پہنچیں گے۔

پاکستان کے لیے سرخ خطرے کی حقیقی نوعیت کیا تھی، اور افغانستان کے شہروں، پہاڑوں اور وادیوں میں داخل ہونے والی 80 ہزار روسی فوج کا سامنا کیسے کیا جاسکتا تھا، صدر نے اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی زمے داری بری فوج کے کسی جرنیل کو نہیں سونپی۔ ان میں بعض لائق کمانڈر ہو

سکتے تھے،لیکن آندھیوں اور طوفانوں میں ہر شخص کھڑا نہیں رہ سکتا اور خوف زدہ کر دینے والی تاریکی میں ہر ایک کو راستہ سجھائی نہیں دیتا۔

''کسی طرح پاکستان کے لیے دو سال حاصل کر لو'' صدر ضیاالحق نے جنرل اختر سے اس طرح کہا، جیسے ایک بیمار بچے کا باپ ڈاکٹر سے کہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس اثنا میں دنیا سے مدد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ انہوں نے آئی ایس آئی کے سربراہ کو افغانستان کی صورت حال پر جلد از جلد رپورٹ پیش کرنے کے لیے کہا۔ جنرل اختر چھ ماہ سے افغانستان کا جائزہ ہی تو لے رہے تھے، جہاں سے مہاجروں کا سیلاب امڈا چلا آتا تھا، اور جہاں وہ کچھ عرصے سے محدود سی مدد پہنچا رہے تھے۔

جنرل اختر نے اپنی رپورٹ صدر کو پیش کی تو وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ یہ روسیوں کو افغانستان میں الجھائے رکھنے کا نہیں، آمو دریا کے اس پار دھکیلنے کا منصوبہ تھا۔ یہ ایک مکمل دستاویز تھی۔ افغانستان کے جغرافیائی حقائق، پہاڑ، شہر، وادیاں اور راستے اور سب سے بڑھ کر آزادی کے لیے زندگیاں نچھاور کرنے پر آمادہ افغان، دنیا میں ان جیسی کوئی دوسری قوم نہ تھی۔ سخت جان اور جنگجو، انتقام پسند، غیر ملکیوں سے دور رہنے اور انہیں شک کی نظر سے دیکھنے والی، انفرادیت پسند، حریت کیش، اور موت ان کے لیے لمحہ گزراں تھی، جو کبھی خوف زدہ نہیں ہو سکتے کہ جانکنی کی ایک ساعت کے بعد بہشت بریں کی وادیاں اور جنت گم گشتہ کے جاں افروز نظارے تھے۔

دو آدمی تاریخ کے ایک نئے دور کی دہلیز پر کھڑے تھے اور ان سے اتفاق کرنے والا کوئی نہ تھا۔ سیاسی عناصر کی حمایت کا تو سوال ہی نہ تھا، لیکن فوج کے مفکرین اور جرنیل بھی اپنے لیڈر سے متفق نہ تھے، لیکن اب جبکہ صدر جانتے تھے کہ یہ ایک روایتی جنگ نہیں ہوگی، اور افغان گوریلا لڑائی کے اہل ہیں، تو انہوں نے یہ کھیل کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ انہیں معلوم تھا کہ اس کے نتیجے میں:

۱۔ ملک کے اندر ان کی اپوزیشن بالآخر مضبوط ہوگی، سیاسی رہنما نہ سہی، لیکن اپنے خدا پر یقین اور جہاد پر ایمان رکھنے والے عوام ان کا ساتھ دیں گے۔

۲۔ اسلامی دنیا کے بعض ممالک کی ہمدردیاں بھی بالآخر انہیں حاصل ہو کر رہیں گے۔

۳، کمیونزم کی پیش قدمی سے خوف زدہ جمہوری اور آزاد دنیا بھی ان کا ساتھ دے گی۔

منصوبہ ساز جنرل اختر کو اس کا کوئی گمان نہ تھا کہ یہ ذمے داری، اتنی بڑی ذمے داری ان کو سونپی جائے گی، لیکن صدر نے ان سے کہا کہ وہ خود ہی اپنے منصوبے پر عمل درآمد کا آغاز کریں کہ وہی اس کے خالق اور اس پر سب سے زیادہ یقین رکھنے والے آدمی ہیں۔ صدر نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ وہ اس منصوبے پر کس طرح کام کا آغاز کریں۔ وسائل کہاں سے آئیں گے، اسلحہ کہاں سے ملے گا، اور کس کے سپرد کیا جائے گا۔ جنرل اختر کے ایک نائب کے مطابق سب کچھ صفر سے شروع کرنا تھا۔ جنرل اپنے دفتر پہنچے اور انہوں نے افغانستان کا نقشہ طلب کیا تو معلوم ہوا کہ ایسا کوئی نقشہ ان کے دفتر میں موجود نہیں۔ جرنیل کے ہاتھ خالی تھے، لیکن دل امید سے آباد تھا۔ اس کا سب تجربہ، سارا وقار، سب کچھ داؤ پر تھا، وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔

جنرل اختر عبدالرحمٰن نے صدر ضیاالحق سے رابطہ قائم کیا اور کہا کہ فوج کے اسلحہ ڈپوؤں میں جو متروک 303 رائفلیں پڑی ہیں، وہ انہیں دے دی جائیں۔ یہ رائفلیں افغان حریت پسندوں کو دی گئیں۔ نہایت سختی کے ساتھ انٹیلی جنس ایجنسی کے اعلیٰ افسروں کو حکم دیا گیا کہ اس عمل میں انتہا درجے کی رازداری برتی جائے تاکہ روسیوں پر یہ کھیل منکشف نہ ہو سکے۔ آئی ایس آئی کے افسروں کو اس رازداری کے لیے قلیوں کا کام کرنا پڑا اور بعض اوقات وہ ضروری ساز و سامان اپنے کندھوں پر اٹھا کر لے جاتے۔ جن افغان رہنماؤں سے رابطہ کیا گیا، ان سے بھی کہہ دیا گیا کہ وہ کسی دوسرے کو نہیں بتائیں گے۔ انہیں خوب سمجھا دیا گیا کہ اس معاملے میں پردہ پوشی کی کیا اہمیت ہے۔ چنانچہ ایک طویل عرصے تک مختلف گروپ ایک دوسرے کی

کارروائیوں سے نا آشنا رہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے افغانستان کے طول وعرض میں ایک قومی بغاوت پھوٹ پڑی، لیکن روسیوں کا ردعمل بھی جو چند ہفتوں میں بغاوت کو کچلنے کا منصوبہ لے کر آئے تھے، اتنا ہی سخت تھا۔ انہوں نے راستوں پر پہرے بٹھا دیے اور آبادیوں کو ادھیڑنے پر تل گئے۔ قتل وغارت کے اس سیلاب کا مقابلہ کرنے کے لیے اسلحہ کی ضرورت تھی اور یہ کہاں سے آتا۔

امداد کی پہلی کھیپ چین سے آئی۔ یہ وہ اسلحہ تھا، جو مدتوں پہلے انہوں نے روسیوں سے خریدا تھا یا چین کی ان اسلحہ ساز فیکٹریوں میں ڈھالا گیا تھا، جو چین سوویت دوستی کے دور میں روسیوں کی مدد سے بنائی گئی تھیں اور جن کی مصنوعات الگ سے شناخت نہیں کی جاسکتی تھیں۔ کچھ اسلحہ مصریوں سے ملا، جو جمال عبدالناصر نے اپنے اشتراکی سرپرست سے حاصل کیا تھا، اور اب اس کے خلاف برتا جانے والا تھا۔

رفتہ رفتہ امریکیوں کو جن کے اخبارات آزادی کی جنگ لڑنے والوں کو باغی کہتے تھے اور جن کا خیال تھا کہ مزاحمت جلد دم توڑ دے گی، اندازہ ہونے لگا کہ روسی ایک دلدل میں آپھنسے ہیں اور انہیں اس میں مزید الجھایا جاسکتا ہے۔ ویت نام کے زخم کچھ زیادہ پرانے نہیں تھے اور ابھی تک ان سے لہو رس رہا تھا۔ دنیا میں کمیونزم کی پے در پے کامیابیوں نے امریکیوں کو آزردہ کر رکھا تھا۔ ادھر ایران سے پسپائی ایک تازہ زخم تھا۔ امریکی اخبارات، رائے عامہ اور پھر نئے انتخابات کی تیاریوں کے غلغلے میں کارٹر کی ناکامیوں کا چرچا کرنے والے صدارتی امیدوار ڈونلڈ ریگن نے دباؤ بڑھانا شروع کیا۔ اب ان کے لیے ''شیطانی سلطنت'' سے قرض چکانے کا وقت آپہنچا تھا۔

امریکی سینیٹرز، ارکان کانگریس اور سی آئی اے کے افسر اسلام آباد پہنچنے لگے۔ صدر ان سے ملے لیکن تفصیلات جاننے کے لیے ان میں سے ہر ایک کو جنرل اختر سے ملاقات کا مشورہ دیا گیا۔ انہیں یقین تھا کہ وہی شخص انہیں بہتر طور پر قائل کرسکتا ہے، جس نے خود انہیں قائل کرلیا تھا۔ جنرل اختر اپنے مہمانوں کے ساتھ سادہ اور بے ساختہ انداز میں بات کرتے تھے۔ افغانستان کے جغرافیائی، سیاسی اور فوجی حقائق اب انہیں ازبر ہو گئے تھے۔ افغانستان کی ماضی قریب کی تاریخ پر ان کی نظر تھی، اور اب تو اس لیے بھی وہ یقین کے ساتھ بات کرسکتے تھے کہ حریت پسندوں نے توقع سے کہیں بڑھ کر کامیابیاں حاصل کرلی تھیں۔ ایسے سرفروش اور سخت جان لوگ، دنیا میں کہیں اور نہیں پائے جاتے، وہ مغرب سے آنے والوں کو بتاتے اور مبالغہ کے بغیر ان سے صاف صاف انداز میں بات کرتے۔ قدرت نے انہیں غیر معمولی طور پر واضح ذہن دیا تھا۔ وہ کسی سے مرعوب ہونے والے نہیں تھے۔ انہیں تصنع سے نفرت تھی۔ وہ اعداد وشمار کا جال نہیں بچھاتے تھے، اور نہ ہی غیر متعلق گفتگو کرتے تھے۔ کم سے کم لفظوں میں وہ مدعا بیان کرتے، عاجزی نہ رعونت، خوشامد نہ بے دلی، غیر ضروری جوش وخروش نہ غیر معمولی توقعات۔ ان کا مخاطب متاثر ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔

امریکی اب مدد کرنے پر آمادہ تھے، لیکن ان کی اپنی شرائط تھیں۔ وہ پاکستان کے حکومتی نظام سے نامطمئن تھے۔ اسلحہ براہ راست افغان کمانڈروں کو دینا چاہتے تھے اور ان کا مطالبہ تھا کہ پاکستان اپنے ایٹمی پروگرام سے دستبردار ہوجائے۔ صدر کا جواب تھا کہ پاکستان ایٹم بم نہیں بنا رہا اور جب تک بھارتی اپنی ایٹمی تنصیبات عالمی معائنے کے لیے نہیں کھول دیتا، پاکستان ایسا نہیں کرسکتا۔ جہاں تک پاکستان کے سیاسی نظام کا تعلق تھا، یہ اس کا اندرونی معاملہ ہے اور امریکیوں کو اس میں داخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ کیا امریکی امداد براہ راست افغان کمانڈروں تک پہنچائی جا سکتی ہے، تو یہ پاکستان کی آزادی اور خودمختاری کو مجروح کرنے کے مترادف ہوگا، لیکن امریکیوں کو کیسے مطمئن کیا جائے؟

شروع میں کچھ عرصہ امریکیوں نے براہ راست کمانڈروں تک مدد پہنچائی، لیکن پھر جنرل اختر عبدالرحمٰن نے اسلحہ کی تقسیم کا ایک فارمولہ وضع کیا، جس کے تحت پاکستان نے معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بنیادی اصول یہ تھا کہ حریت پسندوں کے کسی بھی گروپ کو اتنی ہی رائفلیں، راکٹ اور گولے ملیں گے، جتنی کہ وہ کارکردگی دکھائے گا۔ پورے انصاف کے ساتھ، کسی رعایت کے بغیر۔

جنرل ضیاالحق نے ہمیشہ سخت سودے بازی کرنے والے امریکیوں کو صاف صاف کہہ دیا کہ وہ ان کی شرائط ماننے پر آمادہ نہیں۔ پورے دو سال ردوقدح میں گزر گئے، بالآخر 1982ء کے آغاز میں امریکی سپر انداز ہو گئے اور اس لیے ہو گئے کہ ان کے مفاد اور اپنی ضرورت کے مطابق تھا۔ سات سال بعد فروری 1988 میں راولپنڈی کے ایوان صدر میں، جب امریکی ارکان کانگریس اور سنیٹرز کا ایک گروپ صدر کو جینیوا معاہدے کی حمایت میں ہموار کرنے کے لیے ملا اور انہیں افغانستان کے لیے امریکی امداد کا حوالہ دیا تو صدر نے انہیں یاد دلایا کہ پاکستان نے کس مشکل وقت سے گزر کر یہ سب کچھ حاصل کیا تھا، اور اس عرصے میں امریکیوں کا طرز عمل کیا تھا۔ ''ہمارے لوگوں نے اپنی جنگ ڈنڈوں اور پتھروں سے شروع کی تھی، صدر نے ان سے کہا۔

اس وقت ببرک کارمل سے براہ راست مذاکرات کی حامی پیپلز پارٹی اور بائیں بازو کے شور مچانے اور تکرار کرتے رہنے والے دانشور ضیاالحق کو امریکی ایجنٹ قرار دے رہے تھے، لیکن مجاہدین امریکہ اور پاکستان کی مشترکہ مہم میں بہتر شرائط کون منوا رہا تھا، کس کا ہاتھ اوپر تھا؟ کون قیادت کے اوصاف سے بہرہ ور تھا؟ اگر نپولین ٹیپو سلطان کی مدد کرنے کے لیے برصغیر پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا تو شرائط کیا ہوتیں؟ کیا پاکستان اور افغان مجاہدین نے اس سے کم تر شرائط قبول کیں؟ کیا انہوں نے اپنی خودداری کا سودا کیا؟ جب وقت آیا تو ضیاالحق نے ان کی بات ماننے سے انکار نہیں کر دیا، اور کیا مجاہدین نے اسلحہ کی بھیک ٹھکرا کر اپنا راستہ الگ نہیں کر لیا؟

ضیاالحق کے سیاسی مخالفین ہی نہیں، آغا شاہی سمیت پاکستان کا دفتر خارجہ بھی روس سے نبرد آزما ہونے کے حق میں نہیں تھا۔ خارجہ دفتر والوں کا کہنا تھا کہ پاکستان فلسطینیوں کی حمایت کرنے والے عرب ممالک کے انجام سے دوچار ہو سکتا ہے، طوائفوں اور بھکاریوں اور مجرموں کے گروہ پیدا ہوں گے۔ وہ افغانیوں کو نہیں جانتے تھے اور ان کے مزاج سے ناآشنا تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ افغانی تو اپنے یتیم ہو جانے والے بچوں کو کسی دوسرے کو سونپنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ دفتر خارجہ کے افسر کہتے تھے کہ روسی جب کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں، تو پھر وہاں سے ان کو کوئی نہیں نکال سکتا۔ جنرل اختر کا جواب یہ تھا کہ افغانیوں کی تاریخ بھی یہی ہے کہ ان کے ملک میں آج تک کوئی ٹھیر نہیں سکا۔ دفتر خارجہ والے ہی کیا، بری فوج کے جرنیل بھی اس تصور کا مضحکہ اڑاتے تھے کہ روسیوں کو افغانستان سے فوجی دباو کے ذریعے پسپا کیا جا سکتا ہے، اور ان میں صدر کے وہ معتمد فوجی جرنیل شامل تھے، جو بعد ازاں افغان حریت پسندوں کی حمایت میں پرجوش تقریریں کرتے پائے گئے۔ ان میں سے ایک جرنیل نے روسیوں کی حمایت میں سرگرم خان عبدالولی خان سے کہا کہ ضیاالحق حماقت میں مبتلا ہیں، اور روسی چاہیں تو ٹینکوں میں نہیں، مرسیڈیز کاروں میں سوار ہو کر تین دن میں کراچی کے ساحل تک جا سکتے ہیں۔ جنرل اختر افغان حریت پسندوں کی کامیابیوں کے اعداد و شمار پیش کرتے اور جب وہ یہ بتاتے کہ اتنے ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں تباہ کر دی گئیں اور اتنے فوجی مار ڈالے گئے، اور اتنے جہاز گرائے تو ان کا مضحکہ اڑایا جاتا۔ پاکستان کے بہت سے ممتاز اخبار نویس اور رہنما اول اول یہ ماننے سے انکار کرتے کہ افغانستان میں کوئی جنگ ہو رہی ہے۔ کامیابیوں کے دعووں کو تو وہ سرے سے فریب کاری قرار دیتے۔ بعض جرنیلوں تک کا یہ عالم تھا کہ وہ اسے آئی ایس آئی کی افسروں کی جعل سازی بتلاتے اور جنرل اختر پر آوازے کستے کہ انہوں نے کریڈٹ حاصل کرنے کے لیے ایک ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ یہ صرف امریکی تھے، جو جانتے تھے کہ آئی ایس آئی کی فراہم کردہ سب رپورٹیں سچی ہیں۔ ان کے سیارے (سٹیلائٹ) افغانستان کے چپے چپے کی تصاویر بنا رہے تھے، ان کے پاس تباہ ہونے والے ایک ایک ٹینک، ٹرک اور جیپ کی تصویر موجود تھی۔

صوبہ سرحد میں آبادی کا تناسب بدل رہا تھا۔ مثلاً وادی کرم میں، جہاں ایک مذہبی گروہ کا غلبہ تھا، اس تناسب کی تبدیلی سے بعض رہنما خاص طور سے پریشان تھے۔ وہ بھارت اور روس کے ہمنوا سیاسی رہنماوں سے مل کر شور و غوغا کر رہے تھے۔ آئی ایس آئی کی خفیہ رپورٹوں کی وجہ سے جن جرنیلوں

کی ترقیاں رک جاتیں، وہ ان لیڈروں کی طرح شوروغل تو نہیں مچا سکتے تھے، لیکن در پردہ مخالفت میں وہ بھی کوئی کسر نہ چھوڑتے۔ جنرل اختر کے مخالفین کی تعداد مسلسل بڑھتی جا رہی تھی۔

دفتر خارجہ مسلسل زور دے رہا تھا کہ روس اور کابل میں اس کی کٹھ پتلی حکومت سے براہ راست بات چیت کر کے مسئلہ حل کر لیا جائے۔ بعض اوقات وہ زور دے کر کہتے کہ اگر موقع ہاتھ سے نکل گیا تو پاکستان کو پچھتانا پڑے گا۔ جنرل اختر اور ان کے ساتھیوں کی رائے یہ تھی کہ روس اب کبھی پاکستان کو معاف نہیں کرے گا، اور یہ کہ آزاد افغانستان ہی پاکستان کے تحفظ کا بہترین راستہ ہے، جہاں پاکستان کی دوست حکومت ہو۔ فلپائن سے لے کر مغربی جرمنی اور فرانس سے لے کر امریکہ اور برطانیہ تک، ساری دنیا کے آزاد اخبارات مجاہدین کی شاندار کامیابیوں سے بھرے ہوتے، لیکن پاکستانی اخبارات اور رہنما جن کا سب سے بڑا مسئلہ صدر ضیاالحق تھے، ملک میں ہر خرابی کے لیے افغان مجاہدین کو ذمہ دار قرار دیتے۔ ملک میں جہاں کہیں کوئی خرابی واقع ہوتی، کوئی حادثہ ہوتا، اسے افغان مجاہدین پر چسپاں کر دیا جاتا۔ 1981ء میں ہتھوڑا گروپ کی وارداتیں ہوئیں، اور آئی ایس آئی نے جلد ہی معلوم کر لیا کہ اس کے پیچھے ایک افریقی ملک کا ہاتھ ہے۔ اس کے ایک سفارت کار کو ثبوت سمیت پکڑ لیا۔ حکومت نے محسوس کیا کہ اس کا چرچا کرنا ملک کے مفاد میں نہیں، لہٰذا اسے جانے دیا گیا۔ ادھر بے شمار سیاسی رہنما، کارکن اور اخبار نویس اس کے لیے افغانیوں کو ذمہ دار قرار دے رہے تھے، جس سرزمین نے جنگ زدہ ملک سے آنے والوں کو پناہ دی تھی، وہ اسے عدم استحکام کا شکار کرنے کی سازش کیوں کرتے؟ لیکن سیاسی بزرجمہر معقولیت کی بات سے زیادہ کے جی بی اور خاد کے افواہ سازوں پر یقین کرنے کے لیے تیار تھے۔ بائیں بازوں کے دانشوروں کا روگ اس سے سوا تھا۔ ان کا نظریاتی سرپرست ایک کمزور اور غریب ملک کی بے بس آبادی پر چڑھ دوڑا تھا، اب ساری دنیا اس پر نفرین بھیج رہی تھی۔ سوشلزم ایک نظریے کے طور پر رسوا ہو رہا تھا اور اب سفاکانہ توسیع پسندی اس کی شناخت بن گئی تھی۔ وہ اس کا انتقام اپنے ہی وطن سے لینا چاہتے تھے۔ وہ ہیروئن کی وبا کے لیے بھی مجاہدین کو ذمہ دار قرار دیتے تھے، حالانکہ 1987ء تک ہیروئن کی ایک فیکٹری بھی افغانستان میں نہیں تھی۔ ہیروئن سازی کا عمل پاکستان کے قبائلی علاقے میں ہو رہا تھا اور اس کا اہتمام کرنے والے مغربی ممالک کے وہ سمگلر تھے، جو اس ہنر سے آشنا تھے اور جن کے پاس ہیروئن بنانے اور اسے سمگل کرنے کے وسائل اور قرینے موجود تھے۔

عام تاثر یہ تھا کہ ساری کی ساری امداد امریکہ سے آ رہی ہے، جہاں سے اسلحہ کے بھرے ہوئے جہاز پاکستان پہنچتے ہیں۔ اس کے برعکس جتنی امداد امریکہ دے رہا تھا، کم وبیش اتنی ہی سعودی عرب سے آ رہی تھی۔ اگر سعودی عرب سمیت کویت اور خلیجی ممالک کے ذاتی طور پر عطیات دینے والوں کی امداد شامل کر لی جائے تو عربوں کی مدد بحیثیت مجموعی امریکہ سے بڑھ جاتی تھی۔ سعودی عرب کی سیکرٹ سروس کے سربراہ شہزادہ ترکی باقاعدگی سے پاکستان کے خفیہ دورے کرتے اور آئی ایس آئی کے صدر دفتر میں جنرل اختر عبدالرحمٰن سے تفصیلی ملاقاتیں کرتے رہتے تھے، جہاں ان کی خواہش پر ان کے لیے کریلے کا سالن پکایا جاتا اور انار کے جوس سے ان کی تواضع کی جاتی۔ بہت سے عرب زکات کی رقم مجاہدین کے لیے بھجواتے۔ آئی ایس آئی کے اعلیٰ افسروں کے بقول اگر سعودی امداد نہ ہوتی تو افغانستان سے واپسی کا ہدف کبھی حاصل نہ کیا جا سکتا۔

طے شدہ نظام یہ تھا کہ آئی ایس آئی جنگ کے لیے درکار اسلحہ اور دوسری اشیا، مثلاً ندیوں والے علاقوں کے لیے ہلکی کشتیوں کی فہرست مرتب کرتی اور یہ فہرست سی آئی اے کو سپرد کر دی جاتی۔ سعودی مالی امداد بھی امریکیوں کو دی جاتی، اور پاکستان کو اس سے مطلع کر دیا جاتا۔ اسلحہ کی خریداری امریکی کرتے تھے اور اس میں آئی ایس آئی کا قطعاً کوئی دخل نہ تھا۔ کلاشنکوف، ہلکی مشین گن، اور دوسرا چھوٹا اسلحہ چین سے خریدا جاتا۔ شروع میں تو سارے اسلحہ کا 90, 80 فی صد چینیوں سے خریدا گیا، جنہوں نے کچھ اسلحہ تحفے کے طور پر بھی دیا۔ بعد میں کچھ مصر سے لیا گیا، اور یہ بھی ایک بڑا انبار تھا۔ کچھ

اسلحہ مغربی ملکوں نے سی آئی اے کو بیچا، جس میں ٹینک شکن بارودی سرنگیں اور راکٹ لانچر شامل تھے۔

مجاہدین کو تین طرح کے اسلحہ کی ضرورت ہوتی:

۱۔ انسانوں کے خلاف جیسے رائفلیں اور ہلکی مشین گنیں

۲۔ گاڑیاں تباہ کرنے کے لیے

۳۔ جہاز گرانے کے لیے

سی آئی اے اسلحہ کی خریداری کے بعد اسے پاکستان پہنچانے کی ذمہ دار تھی۔ پاکستان پہنچتے ہی یہ آئی ایس آئی کے سپرد کر دیا جاتا، جس کے تربیت یافتہ اہلکار اور افسررات کی تاریکی میں اسے خاص طور پر بنائے گئے اسلحہ ڈپوؤں میں منتقل کر دیتے۔ اس عمل میں راز داری کا بڑا غیر معمولی اہتمام تھا اور ہر کڑی بڑی احتیاط سے دوسری سے الگ کر دی جاتی تا کہ دشمن اس تک رسائی حاصل نہ کر سکے۔ مثلاً ہوائی اڈوں سے ایک گروپ اسلحہ ٹرکوں میں لادتا اور اس وقت ڈرائیور موجود نہ ہوتے۔ ٹرک لاد لیے جاتے تو ڈرائیوروں کو بلایا جاتا، جو اسے متعلقہ مقامات پر پہنچانے کے بعد چابیاں گاڑیوں میں چھوڑ جاتے۔ ایک مقررہ وقت کے بعد وہ واپس آتے اور خالی گاڑیاں ان کے حوالے کر دی جاتیں۔ اس طرح اسلحہ ڈپوؤں سے گاڑیوں کی دوسری کھیپ میں نئے ڈرائیور اس اسلحہ کو سرحدوں کے قریب لے جاتے، اور گاڑیاں کھڑی کر کے رخصت ہو جاتے۔ یہاں سے اسلحہ مجاہدین کے سپرد کر دیا جاتا، جو ٹرکوں اور چھوٹی گاڑیوں اور خچروں میں اسے افغانستان کے اندر پھیلے ایک ہزار سے زیادہ جنگی محاذوں پر لے جاتے۔ تیسرے دن خالی ٹرک ڈرائیوروں کو واپس کر دیے جاتے۔

آئی ایس آئی بنیادی طور پر اسلحہ تقسیم کرنے، حکمت عملی بنانے اور تربیت دینے اور حریت پسندوں کو معلومات مہیا کرنے والا ادارہ تھا۔ جنرل اختر نے بالکل شروع ہی واضح کر دیا تھا کہ وہ اپنے ادارے کو ایسے ہر کام سے الگ رکھنا چاہتے ہیں، جس میں روپے کا عمل دخل ہو۔ اس لیے آئی ایس آئی نے اسلحہ کی خریداری کبھی نہیں کی۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ جب اسلحہ سٹور کرنے اور دوسری ضرورتوں کے لیے تعمیرات کا مرحلہ درپیش ہوتا تو یہ کام تعمیرات سے متعلق فوج کے متعلقہ محکمے کے سپرد کر دیا گیا۔ جنرل اختر نے اپنے ادارے میں بہترین لوگوں کو جمع کرنے کی کوشش کی، اور وہ بددیانتی کے کسی واقعہ کا سختی سے نوٹس لیتے تھے۔ انہوں نے اخلاقی خرابی کے شکار افسروں کی آئی ایس آئی سے نکال پھینکا تھا۔ وہ اس معاملے میں ہمیشہ سے سخت رہے تھے اور اب جبکہ وہ ایک جنگ لڑ رہے تھے، تو وہ کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھے۔ کوئٹہ میں چند رائفلیں فروخت کرنے کا ایک واقعہ ہوا تو وہ ذاتی طور پر وہاں پہنچے، حالانکہ وہ عام طور پر سفر سے گریز کرتے تھے اور یہ کوئی بہت سنگین واقعہ نہ تھا، لیکن انہوں نے نہ صرف متعلقہ افراد بلکہ ان کے نگران فوجی افسر کو بھی برطرف کر ڈالا۔ وہ بہت چیخا چلایا، اور اس نے کہا کہ وہ ذاتی طور پر تو اس کے لیے ذمے دار قرار نہیں دیا جا سکتا، لیکن اس معاملے میں جنرل بڑا ہی بے لچک واقع ہوا تھا۔ بددیانتی، غبن اور فریب کے ذرا سے واقعہ پر وہ مشتعل ہو جاتا تھا اور کسی صورت معاف کرنے پر آمادہ نہ ہوتا تھا۔

بعد ازاں اس مرحلے پر جب روسی فوج کی واپسی یقینی ہوگئی، مغربی ذرائع ابلاغ نے افغانستان میں پہنچنے والے اسلحہ میں گڑبڑ کے بہت سے قصے چھاپنا شروع کر دیے۔ وہ یہ تاثر دے رہے تھے کہ گویا امریکی جو کچھ فیاضی سے دے رہے ہیں، وہ لوٹ مار کرنے والے پاکستانی افسر بے دردی سے بیچ کھاتے ہیں۔ اس کے برعکس حقیقت یہ تھی کہ اگر کوئی اسلحہ بیچتا تھا تو وہ امریکیوں کے پسندیدہ بعض مغرب نواز گروپ تھے، جن کی تنظیمیں کمزور تھیں۔ بسا اوقات تو محتاجی کے مارے ضرورت مند لوگ بھی ایسا کرتے، جب انہیں کچھ دوسری چیزوں کی ضرورت ہوتی۔ اور اس کے لیے روپیہ فراہم نہ کیا جا سکتا کہ جنگ ہزار طرح کے مطالبات لے کر آتی ہے لیکن یہ کہنا کہ آئی ایس آئی کے افسر اسلحہ فروخت کر رہے تھے، محض خانہ ساز کہانی تھی، یا مغربی

ذرائع ابلاغ پاکستان اورافغان مجاہدین کو بدنام کرنے کے لیے یہ داستانیں تراش رہے تھے، جو بعدازاں روس سے امریکی مفاہمت کے بعد یکا یک ''حریت پسندوں'' کے بجائے بنیاد پرست بن گئے تھے اگر اسلحہ کی فراہمی میں آئی ایس آئی کے افسر فریب دہی کر رہے ہوتے ،تو اس کا سب سے زیادہ علم سی آئی اے کو ہونا چاہیے تھا اور اسی کو سب سے زیادہ تشویش کا اظہار کرنا چاہیے تھا، لیکن حقیقت یہ کہ سی آئی اے نے اس موضوع پر کبھی آئی ایس آئی سے کوئی باضابطہ شکایت نہیں کی۔ آئی ایس آئی کے ایک اعلیٰ افسر سے جب اس سلسلے میں کرید کرید کر سوالات کیے گئے تو اس نے برہمی سے کہا ''میں آپ سے کہتا ہوں کہ ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا۔ آخر وہ کیوں شکایت کرتے ،انہیں خوب معلوم تھا کہ جنرل اختر خود اس بارے میں کس درجہ حساس ہیں۔

جنرل اختر کا ایک اور کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے چالیس سے زیادہ بے نظم گروپوں کو سات جماعتوں اور پھر ان سات جماعتوں کو ایک متحدہ محاذ کی شکل دیدی۔ افغان مجاہدین اور جنگجو ایک قبائلی معاشرے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ایک دوسرے پر آسانی سے اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ ان میں شخصیتوں کا تصادم آسانی سے راہ پالیتا تھا، جیسا کہ پنج شیر کے کمانڈر احمد شاہ مسعود اور حزب اسلامی کے سربراہ گلبدین حکمت یار کے اختلافات کی صورت میں ہوا۔ وہ دونوں اکٹھے رہے تھے اور انہوں نے مل جل کر روسیوں کے خلاف منصوبے بنائے تھے، لیکن پھر معمولی غلط فہمیوں نے تصادم کی بنیاد رکھ دی اور اس سے افغان جہاد کو نقصان پہنچا۔ وہ دونوں بڑے لیڈر تھے، اور اپنے احکامات کی پابندی چاہتے تھے۔ دونوں لیڈروں کو قریب سے جاننے والی ایک ممتاز پاکستانی شخصیت کے بقول، وہ برگد کے درختوں کی طرح تھے، جن کے نیچے کوئی فصل نہیں اگ سکتی تھی۔ افغان جہاد میں ان دونوں نے قابل قدر کارنامے سرانجام دیے، لیکن پھر ایک وقت آیا کہ 1983ء میں مسعود نے روسی دباو کا شکار ہو کر جنگ بندی کر لی۔ اس سے روسیوں نے فائدہ اٹھایا۔ انہیں علاقے میں اپنی چوکیاں مستحکم کرنے کا وقت مل گیا۔

احمد شاہ مسعود جو نسلاً تاجک ہے، فرانسیسی زبان جانتا تھا، لہٰذا اس کے ساتھ فرانسیسیوں کا گہرا رابطہ رہا، جنہوں نے جنگ میں تو کوئی خاص مدد نہ کی، لیکن جنگ زدہ ملک میں ان کے ڈاکٹر اور اخبار نویس بڑی تعداد میں آتے رہے، یا جاسوس۔ انہوں نے افغانستان کی جنگ آزادی کے لیے اخلاقی امداد فراہم کی، اور اپنے رابطے بنائے۔ مغربیوں نے احمد شاہ مسعود کو ایک عظیم کمانڈر بنا کر پیش کیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہرات کے اسماعیل شاہ کی طرح وہ ایک ایسا کمانڈر تھا، جس نے گوریلا جنگ کو باقاعدہ طور پر سیکھنے اور سکھانے کی کوشش کی۔ اور اس سلسلے یں ماہرین کی مرتب کردہ کتابوں کا مطالعہ بھی کیا، لیکن اس جیسے کچھ اور کمانڈر بھی ملک میں موجود تھے، لیکن مغربی اخبارات اپنے مقاصد پورے کرنے کے لیے ان میں سے بعض کو دوسروں پر ترجیح دیتے اور ان کے کارناموں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ،جبکہ کچھ دوسرے لوگوں کی کردار کشی کے درپے رہتے تھے۔

انہوں نے سب سے بڑھ کر گلبدین حکمت یار کے خلاف مہم چلائی، جس کی ذات میں انہیں مستقبل کا امام خمینی دکھائی دیتا تھا۔ حکمت یار ایک بہت سخت جان اور ڈسپلن کی انتہائی پابندی کا مطالبہ کرنے والے لیڈر ہیں۔ ان کی جماعت اس سلسلے میں ایک مثال ہے۔ وہ ظاہر شاہ کے سخت مخالف ہیں اور اس شخص کو افغانستان کے مصائب کا ذمے دار سمجھتے ہیں، جس نے روسیوں کے ساتھ راہ و رسم بڑھائی اور جہاد کے تکلیف دہ سالوں میں روم کے ایک محل میں مقیم رہا۔ وہ نظریاتی ترجیحات پر زور دیتے ہیں، لیکن ان کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ جب وہ امریکہ گئے تو امریکی صدر ریگن کی خواہش کے باوجود انہوں نے اس کے ساتھ ملاقات سے انکار کر دیا۔ پہلی بار امریکی دفتر خارجہ کے لوگ دعوت لے کر آئے تھے۔ دوسری مرتبہ ریگن نے اپنی پچاس سالہ بیٹی کو ان کے پاس بھیجا، لیکن وہ کسی طرح آمادہ نہ ہوئے۔ ان کی پختہ رائے یہ تھی کہ اور امتحان کا وقت آنے پر یہ پوری طرح درست ثابت ہوئی کہ امریکیوں کو مظلوم افغانوں سے کوئی ہمدردی نہیں، اور وہ سب کچھ اپنے مفادات کے لیے کر رہے ہیں۔ اس کے بعد امریکی ان کے خلاف ہوتے گئے۔ یہودی اخبار نویس اور امریکی کانگریس کے رکن سٹیفن سولارز ایسے پاکستان دشمن یہودی سیاستدان خاص طور پر ان کے خلاف تھے۔ ادھر بھارتی بھی

سے زیادہ انہی پر نکتہ چینی کرتے تھے۔ اور ان کی دو بڑی وجہیں تھیں۔ ایک یہ کہ حکمت یار افغانستان کی آزادی کے بعد پاکستان سے بہت قریبی تعلقات ،اور اگر ممکن ہو تو دونوں ملکوں کی کنفیڈریشن کے حامی تھے۔۔ ثانیاً یہ کہ وہ ظاہر شاہ کے مخالف تھے، اور سابق شاہ کے لیے بھارتیوں کے دل میں نرم گوشہ موجود تھا۔

1987ء سے مغربی اور بھارتی اخبارات نے ایک کورس کی شکل میں گانا شروع کر دیا کہ امداد کا سب سے بڑا حصہ حکمت یار کو دیا جا رہا ہے۔ اس میں ذرہ برابر صداقت نہیں تھی۔ جنرل اختر عبدالرحمٰن کے لیے افغان لیڈروں مین کوئی پسندیدہ اور ناپسندیدہ نہیں تھا۔ اپنے مزاج کے مطابق وہ اصولوں کی سختی سے پاسداری کرنے والے آدمی تھے اور جانتے تھے کہ جب آپ ناانصافی اور من مانی سے کام لینے لگتے ہیں، تو کبھی بہترین نتائج حاصل نہیں کر سکتے۔ انہوں نے ہر تین ماہ کے بعد مرتب کی جانے والی رپورٹوں کے مطابق اسلحہ جاری کرنے کا نظام رائج کیا، اور کبھی کسی کو اس سے انحراف کرنے کی اجازت نہ دی ایسا نہیں تھا کہ جس پارٹی کے ممبر زیادہ ہوں، اسے زیادہ اسلحہ دیا جائے۔ دیکھا یہ جاتا تھا کہ کس جماعت کی ضرب لگانے کی قوت کتنی ہے۔ مثال کے طور پر ایک گروپ کابل شہر میں ویسی ہی کارکردگی دکھانے پر جس کا مظاہرہ کسی دوسری پارٹی نے پاکستان سے متصل قندھار یا پکیتا صوبے میں کیا ہو، زیادہ اسلحہ دیا جاتا، کیونکہ دارالحکومت میں کارروائی سے زیادہ نتائج حاصل کیے جا سکتے تھے۔ اس طرح حساس اور مشکل تنصیبات اور ہوائی اڈوں پر حملہ کرنے والوں سے بہترین سلوک کیا جاتا۔ 1987ء تک مختلف جماعتوں کو پچھلے آٹھ سال یں مختلف سہ ماہیوں میں ملنے والے اسلحہ کا تناسب یہ تھا:

حزب اسلامی (حکمت یار): 18 سے 20 فی صد تک

جمعیت اسلامی (استاذ برہان الدین ربانی): 18 سے 19 فی صد

اتحاد اسلامی افغانستان (عبدالرب رسول سیاف): 17 سے 18 فی صد

حزب اسلامی (یونس خالص گروپ): 12 سے 13 فی صد

حرکت انقلاب اسلامی (مولوی محمد نبی محمدی): 12 سے 13 فی صد

محاذ ملی اسلامی افغانستان (سید احمد گیلانی): 8 سے 10 فی صد

جبہ نجات ملی (پروفیسر صبغت اللہ مجددی): 3 سے 5 فی صد

مختلف جماعتوں کو ان کی کارکردگی کے تناسب سے جو کچھ ملتا، اس میں امریکیوں سمیت کوئی مداخلت نہیں کر سکتا تھا۔ امریکی سفیر، سی آئی اے کا سربراہ، اور نہ صدر ضیاالحق یا صدر ریگن؛ البتہ امریکہ کے مختلف محکموں، پنٹاگان، نیشنل سیکورٹی اور سی آئی اے میں مختلف ترجیحات کے حوالے سے اختلافات تھے۔ ان میں سے ہر ایک امریکی نظام کے اندر کریڈٹ حاصل کرنے اور دوسرے کے کریڈٹ میں کمی کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ لیکن اس سے پاکستان یا آئی ایس آئی کو کوئی واسطہ نہ تھا۔ بعض امریکی ادارے، اخبارات اور سیاست دان یہ اعتراض کرتے تھے کہ بنیاد پرستوں کو زیادہ اسلحہ مل رہا ہے اور یہ بات درست بھی تھی، کیونکہ اول الذکر چار جماعتوں کو 65 سے 70 فی صد اسلحہ دیا جا رہا تھا، جنہیں بنیاد پرست کہا جاتا تھا، مگر جنگ بھی تو یہی لڑ رہے تھے، اور دائرہ عمل بھی انہی کا وسیع تھا۔ بعض امریکیوں کی اس خواہش کے باوجود کہ ظاہر شاہ کی حامی اور مغرب سے بہتر رابطہ رکھنے والی جماعتوں کی زیادہ مدد کی جائے، آئی ایس آئی بھرپور رابطہ رکھنے والی سی آئی اے نے کبھی باضابطہ طور پر یہ سوال نہیں اٹھایا۔ وہ ایسا کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہ کرتے تھے۔ افغانستان کے اندر وہ جاسوسی کا بہترین نظام رکھتے تھے۔ سٹیلائٹ فوٹوگرافی کے علاوہ ان کے پاس جاسوسی کے بہترین

الیکٹرانک آلات موجود تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ آئی ایس آئی اعداد وشمار مرتب کرنے میں کس قدر عرق ریزی اور صحت سے کام لیتی ہے۔ وہ آئی ایس آئی کی جنگی مہارت سے خوش ہی نہیں، مرعوب بھی تھے۔ خود انہوں نے نکارا گوا، کیوبا اور بعض دوسرے مقامات پر جنگی کاروائیوں میں مدد دینے کے جو منصوبے بنائے تھے، وہ بری طرح ناکام رہے تھے۔ وہ اعتراف کرتے تھے کہ اس عمل میں دنیا کا کوئی ادارہ پاکستانی خفیہ ایجنسی کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور یہ بھی سمجھتے تھے کہ اس میں دخل اندازی سے معاملات میں بگاڑ تو پیدا ہوسکتا ہے، بہتری نہیں۔

سی آئی اے کو افغان حریت پسندوں کی تربیت سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ یہ عمل مکمل طور پر آئی ایس آئی انجام دیتی تھی۔ ہر چند کہ روسی وافغانی اور بھارتی ذرائع ابلاغ اور پاکستان میں ان کے بعض کارندے یہ غوغا کرتے رہے کہ اس عمل میں چینی اور امریکی انسٹرکٹر شریک ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ کبھی ایک بھی امریکی یا چینی اس کارروائی میں شریک نہ کیا گیا۔ یہ خالصتاً آئی ایس آئی کا تشکیل کردہ نظام تھا، جو افغانستان میں داخل ہونے والی روسی افواج اور ان کے تربیت کردہ افغان دستوں کے طریق کار کو ملحوظ رکھتے ہوئے بنایا گیا۔ پھر اس میں مختلف علاقوں کی ضرورتوں کا خیال رکھا جاتا۔ جو لوگ، جس طرح کے علاقوں میں، جس طرح کے کام زیادہ بہتر طور پر انجام دینے کے اہل تھے، انہیں وہی سکھایا جاتا۔ پانی کے اندر بارود لگانے، پل اڑانے، راکٹ برسانے اور سب سے بڑھ کر میزائل فائر کرنے کی تربیت۔

یوں تو روسیوں نے افغانستان میں ایٹم بم کے سوا ہر ہتھیار برت ڈالا، ان کے ٹینکوں نے سکندر اعظم کے زمانے سے آباد چلے آنے والے گاؤں برباد کر ڈالے، لیکن ان کی اصل برتری فضا میں تھی، جہاں ایم آئی 24 گن شپ ہیلی کاپٹر اور مگ طیارے پرواز کرتے۔ جنرل اختر نے پاکستان کے دورے پر آنے والے امریکی افسروں اور رہنماؤں کو 1982ء ہی میں کہنا شروع کیا کہ میزائلوں کے بغیر روسی برتری ختم نہیں کی جاسکتی، لیکن وہ غیر منظم افغان چھاپہ ماروں کو جدید سٹنگر میزائل فراہم کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ کئی سال کی مسلسل کوششوں کے بعد 1984ء میں حریت پسندوں کو برطانیہ کیلئے بلوپائپ میزائل فراہم کر دیے گئے تھے، جو فاک لینڈ کی جنگ میں بری طرح ناکام رہے تھے۔ جنرل اختر اور ان کے نائب نے اس کی سفارش نہیں کی تھی، لیکن معلوم نہیں کیونکر کروڑوں روپے کے یہ اڑھائی تین ہزار میزائل پاکستان پہنچا دیے گئے۔ جیسا کہ اہل مغرب کا مزاج ہے، انہوں نے اخبارات میں اس کا چرچا تو بہت کیا، لیکن جب برتنے کا مرحلہ آیا تو معلوم ہوا کہ اس طرح کی جنگ میں، جو افغانستان میں لڑی جارہی ہے، بلوپائپ میزائل لوہے کے بے جان ٹکڑوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ بعض ذرائع اصرار سے کہتے ہیں کہ ان سے ایک بھی جہاز گرایا نہ جاسکا، جبکہ دوسروں کو دعویٰ ہے کہ ایک یا دو جہاز تباہ کرنے کی ''عظیم'' کامیابی حاصل کر لی گئی۔ پھر لوہے کا یہ انبار ڈبوں میں بند کر کے رکھ دیا گیا، اور جنرل اختر نے امریکیوں سے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر وہ سٹنگر میزائل نہیں دے سکتے تو روسی پسپائی کے خواب کو فراموش کر دیں۔ سالہا سال کی سرمایہ کاری کے بعد اب جبکہ روسیوں کی ناکامی کی امید پیدا ہو چلی تھی، امریکی آخر کار اس پر آمادہ ہو گئے۔

25 ستمبر 1986ء کو جلال آباد کے ہوائی اڈے کی طرف سے پہلا سٹنگر میزائل فائر کیا گیا، اور یہ ٹھیک نشانے پر لگا۔ پہلے ہی حملے میں پانچ میزائلوں سے تین جہاز گرا لیے گئے۔ ان میں سے ایک رن وے پر تباہ ہوا، اور باقی دونوں ایک کلومیٹر کے دائرے میں جا گرے۔ افغانستان کی سات سالہ جنگ میں یہ ایک روز مسرت تھا۔ چند ماہ بعد جب 117 میزائل فائر کیے جا چکے اور حساب لگایا گیا تو 85 جہاز گر چکے تھے۔ امریکی ان نتائج پر حیرت زدہ رہ گئے۔ خود ان کی اپنی فوج میں زمانہ امن میں کامیابی کا تناسب 60 سے 65 فی صد تھا، جو زمانہ جنگ میں آدھا رہ جاتا، جبکہ افغان حریت پسند حالت جنگ میں 80 فی صد نتائج حاصل کر رہے تھے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ انہوں نے براہ راست میزائل ایجاد کرنے اور سب سے پہلے برتنے والے امریکیوں سے اس کی تربیت نہیں پائی تھی۔ امریکیوں نے آئی ایس آئی کے افسروں کو سکھایا تھا، جو سی آئی اے کو براہ راست حریت پسندوں

تک رسائی دینے پر آمادہ نہ تھی۔ بعدازاں حریت پسندوں نے ان سے سیکھا۔ اس طرح آئی ایس آئی کے افسروں نے بعض ہتھیار برتنے کی تربیت چینیوں سے حاصل کی، اور پھر افغان مجاہدین کو تربیت دی۔ امریکیوں کو افغان جہاد میں کسی چیز سے اتنی حیرت نہیں ہوئی، جتنی میزائل برتنے میں مجاہدین کی غیر معمولی کامیابی سے۔ جنگ کے آغاز کی طرح وہ اب بھی یہ نہیں سمجھ رہے تھے کہ حریت کیش افغانوں کے لیے جنگ کتنا سنجیدہ معاملہ ہے اور یہ کہ اسی میدان میں ان کی بہترین صلاحتیں بروئے کار آتی ہیں۔ سٹنگر دنیا کا بہترین میزائل تھا۔ اس نے جنگ کا نقشہ ہی بدل ڈالا۔ دوسرے میزائلوں کے برعکس وہ جہاز سے حرارت خارج کرنے کے عمل میں ہدف سے انحراف کر سکتے تھے، سٹنگر ایسا میزائل تھا، ایک بار درست نشانہ لینے کی صورت میں، جس کا وار خطا نہیں ہوتا تھا۔

ایک دوسرا ہتھیار جس نے جنگ کا پانسہ پلٹنے میں اہم کردار ادا کیا، 107 سنگل بیرل راکٹ لانچر تھے، جن سے عمارتوں اور گاڑیوں کو نشانہ بنایا جاتا ،اور جن کی رینج 9 کلومیٹر تک تھی۔ چین کا بنایہ ہتھیار 1985ء میں افغانستان پہنچا اور جلد ہی استعمال کیا جانے لگا۔ دو آدمی اسے آسانی سے اٹھا کر لے جا سکتے تھے اور اس وقت جب روسیوں اور کارمل دستوں نے تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر چوکیاں بنا دی تھیں، اور خچروں پر اسلحہ لے جانا مشکل ہوتا جا رہا تھا، رات کی تاریکی میں حریت پسند دبے پاوں ان راکٹ لانچروں کے ساتھ فوجی چوکیوں کے درمیان سے گزر جاتے۔ جب کسی مقام پر چند درجن راکٹ لانچر پہنچ جاتے تو اردگرد کی چوکیوں کا صفایا کرنا آسان ہو جاتا۔

آئی ایس آئی کے صدر دفتر میں 1984ء کا سال بہت طویل محسوس ہوتا تھا۔ جنگ کا شکار انسانوں کا ایک سیلاب پاکستان کا رخ کر رہا تھا۔ افغان بچے برفانی بلندیوں پر جان سے گزر جاتے یا کھلونا بموں کی نذر ہو جاتے۔ زہریلی گیس سمیت روسی ہر ہتھیار آزما رہے تھے۔ انہوں نے ہزاروں سال پرانے دیہات کو لوح زمین سے مٹا دیا، آبادیاں کھنڈر بن رہی تھیں، باغ اور جنگل کاٹے جا رہے تھے، دیہات قصبے اور شہر بمباری سے لرز رہے تھے۔ افغانستان کا دوسرا بڑا شہر، افغانستان کے بانی احمد شاہ ابدالی کا دارالحکومت قندھار ملبے کا ڈھیر بن گیا۔ یہ حوصلوں کی آزمایش کا سال تھا، لیکن افغان مجاہد اس امتحان سے سرخرو ہو کر گزر گئے۔ 1985ء کے آغاز میں جنرل اختر فتح کے یقین سے سرشار تھے، جب مسٹر گورباچوف کریملن کے مطلع اقتدار پر نمودار ہوئے۔ وہ دن رات کام میں جتے رہے۔ افغانستان سے انہیں ایک عجیب اور بہت گہری محبت ہو گئی تھی۔ افغان رہنماوں سے ان کی پہلے سے زیادہ ملاقاتیں ہونے لگیں، جنہیں بہترین خفیہ انتظامات کے ساتھ ان کے گھر پر لایا جاتا تھا۔ اب وہ اس موضوع پر ایک اتھارٹی اور وثوق سے گفتگو کرتے تھے اور حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اس وقت افغانستان کو دنیا میں سب سے زیادہ سمجھنے والے آدمی تھے۔ آئی ایس آئی کے علاوہ سی آئی اے کی فراہم کردہ معلومات کا انبار ہر روز ان کے پاس آتا۔ اب لوگ انہی سے رجوع کرتے اور انہی کی بات سنتے تھے۔ ان میں سے اگر کسی کو ان کی بات یا انداز ناپسند بھی ہوتا تو اس کے لیے بھی انہیں سننے اور ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ انہوں نے عمر بھر شاید ہی کبھی چھٹی کی ہو، لیکن اب تو اس عشق کی طرح جو آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے، دن رات ان پر یہی ایک دھن سوار رہتی۔ وہ دوروں اور تقریبات سے گریز کرتے اور رات گئے بستر پر لیٹ جانے تک، ٹیلی فون پر دفتر سے رابطہ رکھتے اور احکامات صادر کرتے رہتے۔

23 مارچ 1985 کو صدر نے غیر جماعتی انتخابات کے بعد محمد خان جونیجو کو اقتدار سونپ دیا۔ رفتہ رفتہ اخبارات کو زیادہ آزادی ملی تو افغان پالیسی پر نکتہ چینی بڑھنے لگی۔ ''ترقی پسند'' اخبار نویس تو ظاہر ہے کہ لمبی داڑھیوں اور ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھ کر پریس کانفرنس شروع کرنے والے افغان لیڈروں کے خلاف تھے ہی، بہت سے دوسرے صحافی بھی آزادی کے لیے برسرپیکار افغانوں کے خلاف لکھ رہے تھے۔ یہ بات کسی طرح مغربی تعلیم یافتہ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی، کہ اس دور میں اسلام کے نام پر لوگ اپنی جانیں نچھاور کر سکتے ہیں اور یہ کہ روس ایسی عظیم قوت کو عسکری ناکامی سے

دوچار کیا جاسکتا ہے۔ پاکستانی صحافت میں بائیں بازو کا پروپیگنڈہ ہمیشہ موثر رہا تھا، اوراب یہ اپنا رنگ دکھا رہا تھا۔ ببرک کارمل کے اقتدار سنبھالنے کے بعد افغانستان جانے اور کئی ماہ تک پل چرخی جیل میں قید رہنے والے مختار حسن نے ایجنسی افغان پریس کے نام سے ایک مختصر سی نیوز ایجنسی قائم کی ۔لیکن اس طرح کی اس کی اجازت حاصل کرنے کے لیے لندن میں صدر دفتر بنانا پڑا۔ یہ ایجنسی ہر روز ایک یا دو خبریں اردو اور انگریزی زبان میں جاری کرتی اور ہفتہ میں ایک آدھ فیچر۔ ان خبروں اور فیچروں کی اشاعت کے لیے اخبارات سے درخواست کرنا پڑتی اور بعض اوقات اس کے باوجود ان کی اشاعت ممکن نہ ہوتی۔ ملک میں آئے روز بموں کے دھماکے ہوتے اور بے گناہ لوگ مارے جاتے، تو سیاسی لیڈروں کے بیانات شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوتے کہ اس کے ذمے دار افغان مہاجر ہیں۔ لاہور کے ایک مشہور کالم نگار نے جو 1988ء کے آغاز میں افغانوں کو حریت پسند تسلیم کرنے پر آمادہ ہوگے، افغان جہاد کی حمایت کرنے والے ایک اخبار میں لکھا، یہ کہنا مشکل ہے کہ دھماکے کون کرا رہا ہے۔ ان کا اشارہ یہ تھا کہ ممکن ہے کہ خود جنرل ضیاالحق کی حکومت ہی ایسا کرا رہی ہو۔ دانشور حنیف رامے نے جو بعد ازاں گلبدین حکمت یار کو خراج تحسین پیش کرتے پائے گئے، لاہور کے ایک اجتماع میں حریت پسندوں کو امریکی کارندے قرار دیا۔ جمعیت علماے پاکستان کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی نے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کرنل قذافی سے واسطہ رکھتے ہیں، اوراب لادین بعث پارٹی کے سربراہ صدام حسین کو صلاح الدین ایوبی قرار دے رہے ہیں، اپنی پارٹی کے پلیٹ فارم کو مجاہدین کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کی، لیکن مولانا عبدالستار خان نیازی اسے زندگی اور موت کا مسئلہ بنا کر سدراہ بن گئے۔ مولانا فضل الرحمٰن افغان مجاہدین کی حمایت کرتے تھے، لیکن اسی سانس میں یہ بھی کہتے تھے کہ یہ روس اور امریکہ کی جنگ ہے۔ بعد میں دیوبندی مکتب فکر کے بہت سے افراد اپنے طور پر جہاد میں حصہ لینے کے لیے افغانستان بھی گئے لیکن مولانا فضل الرحمٰن کی جماعت نے بحیثیت مجموعی اس میں وہ کردار ادا نہ کیا ،جس کی حکومتوں سے ٹکرانے والے ان سخت جان لوگوں سے امید کی جاتی تھی۔ البتہ ان سے الگ ہونے والے درخواستی گروپ کے لوگ آواز اٹھاتے رہے۔ صدر ضیاالحق کے پروں کے اندر پیدا ہونے والی مسلم لیگ کی حالت عجیب تھی۔ اسے مرکز اور چاروں صوبوں میں اقتدار حاصل تھا، لیکن وہ پاکستان کے لیے زندگی اور موت ایسی اہمیت رکھنے والے اس معاملے سے لاتعلق تھی۔ سرحد اور بلوچستان میں اس کے وزرائے اعلیٰ ارباب جہانگیر اور جام آف لسبیلہ سرکاری طور پر افغان مجاہدین کی حمایت کرتے، لیکن بند کمروں کے اجلاسوں اور نجی گفتگوؤں میں اس سے اظہار بیزاری کرتے۔ اسلام آباد میں ایک مسلم لیگی رکن قومی اسمبلی نے ایک روز اپنے دوستوں سے کہا، ''معلوم نہیں افغانستان کے سلسلے میں ان دنوں حکومت کی پالیسی کیا ہے۔'' طرفہ تماشا یہ تھا کہ جونیجو کو اس سلسلے میں بنیادی پالیسی سے تو آگاہ کر دیا گیا، اور ظاہر ہے کہ ان کے لیے اس کی حمایت کے سوا کوئی راستہ نہ تھا، مگر انہیں مسلسل اعتماد میں لینے اور تصویر کے اندر رکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔ خود انہیں بھی اس سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ سال بھر تو وہ اس صورتحال کو سمجھ ہی نہ سکے۔ بعد میں جب خطرناک مرحلہ آیا تو وہ ضیاالحق سے الگ ہو کر کھڑے ہوگئے۔ کچھ تو اس مجبوری سے کہ ایک خفیہ آپریشن تھا، اور کچھ اس سبب سے کہ اس طرح کے نظام حکومت میں عوامی رائے کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی، پاکستانی ریڈیو اور ٹیلی وژن کو رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے کبھی استعمال نہ کیا گیا، اور جب ضرورت محسوس کی گئی تو وقت گزر چکا تھا۔

ذہین اور طباع گورباچوف نے 1986ء اور 1987 میں افغانستان میں اپنے جرنیلوں کو چھ چھ ماہ کی چار قسطوں میں بغاوت کو سختی سے کچل ڈالنے کی آخری مہلت دی لیکن جب انہیں اندازہ ہوا کہ 15 لاکھ جانیں گنوا دینے والی افغان قوم جھکنے پر آمادہ نہیں، ہر روز کم از کم ایک روسی جہاز زمیں بوس ہو جاتا ہے، ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں تباہ ہو رہی ہیں اور مرنے والوں کی تعداد میں مسلسل اضافے سے روس میں اضطراب بڑھتا جا رہا ہے تو روسی معیشت کی تعمیر نو کے آرزومند لیڈر نے واپسی کا فیصلہ کیا۔ امریکیوں کو واضح طور پر اس کا اشارہ ملا تو وہ مستقبل کے نقطہ نظر سے نئی منصوبہ بندی کرنے

لگے پاکستان کا دفتر خارجہ اب جنیوا مذاکرات کی مردہ مشق میں روح پھونکنے کے لیے بے تاب تھا۔ صاحبزادہ یعقوب علی خاں اور ان کے ساتھی کامیاب سمجھوتے کا کریڈٹ لینے کے لیے بہت بے قرار تھے۔

بہت پہلے جب روسیوں نے ابھی جنگ کی حرارت محسوس کرنا شروع نہیں کی تھی، افغان سیل کے ایک اجلاس میں جنرل اختر نے کہا تھا کہ کابل کی زندگی گزارنے والے روسی جرنیل کو جب تک ہراساں اور خوف زدہ نہیں کیا جائے گا، وہ پسپائی پر آمادہ نہیں ہوں گے۔ اب ایک اجلاس میں انہوں نے یہ کہا کہ سرحد پار سے روسی افغانستان میں داخل ہو سکتے ہیں، تو افغان مجاہدین کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ دریائے آمو کے اس طرف مختصر سی کوئی کارروائی کر ڈالیں۔ اس اجلاس میں دوسروں کے علاوہ وزیر خارجہ صاحبزادہ یعقوب علی خاں بھی موجود تھے۔ چیختے ہوئے انہوں نے کہا، اس طرح تو آپ لوگ پاکستان کو برباد کر ڈالیں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ جب ایسا ہوا تو گورباچوف نے اسے اپنے ملک میں افغانستان سے واپسی کے لیے ایک دلیل کے طور استعمال کیا اور وہ زیادہ واضح طور پر مذاکرات کی کامیابی کے سگنل دینے لگے۔ ایک دوسرے موقع پر افغان سیل کے ایک اجلاس میں جب جنرل اختر نے ایسی ہی ایک ایک ''خوف ناک'' تجویز پیش کی تو صاحب زادہ برہم ہو گئے۔ جنرل اختر نے، جیسا کہ ان کا مزاج تھا، اس پر کسی ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ اس ہفت زبان دانشور جرنیل کا احترام کرتے تھے، جو فوج میں ان کا سینئر رہا تھا اور جسے ضیاالحق بھی ''سر'' کہہ کے مخاطب کرتے تھے۔ انہوں نے نہایت تحمل سے اپنے موقف کی حمایت میں دلائل دیے اور اپنی بات منوالی۔ جب اجلاس ختم ہو چکا اور سارے لوگ چائے کی میز کے گرد جمع ہوئے تو جنرل اختر وزیر خارجہ کے پاس گئے اور ان سے کہا، سر! آپ جذباتی ہو گئے۔'' وزیر خارجہ نے کہا، میرا خیال ہے کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔

ایک معتبر ذریعے کو جس نے افغان جنگ کو بہت قریب سے دیکھا اور جسے اندرونی رازوں تک رسائی حاصل تھی، اس پر اصرار ہے کہ 1987ء میں امریکی، جنرل اختر کو ناپسند کرنے لگے تھے۔ وہ کبھی ان سے مرعوب نہیں ہوئے اور کبھی ان سے ماتحتوں کی طرح مودب ہو کر پیش نہیں آئے۔ وہ ہمیشہ دلیل دیتے تھے، اور دلیل طلب کرتے تھے۔ انہوں نے امریکیوں کی طرف سے افغانوں کی مجلس شوریٰ اور عبوری حکومت قائم کرنے کی تجاویز کو کبھی قبول نہیں کیا۔ ان کی سوچی سمجھی رائے تھی کہ اس سے ان کی راہ کھوٹی ہو جائے گی۔ (بعد میں شوریٰ بھی بنی اور عبوری حکومت بھی، اور اس سے افغان کچھ بھی حاصل نہ کر سکے۔

عبوری حکومت کے لیے امریکیوں کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا اور دوسروں کے علاوہ صدر ضیاالحق بھی اس کے قائل ہو گئے تھے۔ افغان لیڈروں کے کئی اجلاسوں میں، جو جہاد میں صدر کے کردار کی وجہ سے ان کا بے حد احترام کرتے تھے، صدر نے انہیں ایسی عبوری حکومت کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کی، جس میں ان کے بعض مخالفین بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ لیکن سات جماعتی اتحاد کے رہنماؤں کی اکثریت اس پر آمادہ نہیں تھی۔ ایسی ہی ایک ملاقات میں، صدر نے انہیں صلح حدیبیہ کا حوالہ دیا، جب رسول اللہ علیہ والہ وسلم نے مشرکین مکہ کی بعض شرائط تسلیم کر لی تھیں، اور جو بالآخر فتح مبین پر منتج ہوئی، لیکن افغان لیڈروں کی رائے مختلف تھی۔ ملاقات میں شامل تین رہنما استاذ برہان الدین ربانی، پروفیسر عبدالرب سیاف اور صبغت اللہ مجددی جو شریعت، شرعی قانون سازی اور حدیث میں ڈاکٹریٹ کی ڈگریوں کے حامل تھے، صدر بحث کرتے رہے۔

اس بارے میں دو آرا پائی جاتی ہیں کہ صدر کی ان کوششوں سے امریکی آگاہ تھے یا نہیں۔ بہرحال کچھ بھی ہو، امریکی اخبارات اب صدر کو ایک ''بنیاد پرست'' کے طور پر پیش کر رہے تھے۔ امریکی سابق شاہ ظاہر شاہ کو اقتدار میں لانا چاہتے تھے، روسی اور بھارتی بھی اسی نظریے کی حمایت کرتے تھے۔ افغان رہنما اس پر آمادہ نہیں تھے اور امریکی صدر ضیاالحق سے ناراض تھے کہ وہ یہ بات افغانوں سے منوا کیوں نہیں لیتے۔ کیا انہیں معلوم نہیں تھا کہ اگر صدر چاہیں بھی تو ایسا نہیں کر سکتے۔ افغان زخم خوردہ تھے، ان میں سے ہر خاندان نے اپنا کوئی فرد جنگ میں کھو دیا تھا۔ انہوں نے اپنی جنگ ایک

نعرے اور نظریے کے ساتھ لڑی تھی۔ وہ ادھوری کامیابی سے مطمئن نہیں ہو سکتے تھے۔ امریکیوں کو سب سے زیادہ ناراضی گلبدین حکمت یار کے ساتھ تھی، وہ اب اسے ہیروئن فروشوں کو تحفظ دینے والے شخص اور دہشت گرد کے طور پر پیش کر رہے تھے۔ سب جانتے تھے کہ وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ انہوں نے اس سے پہلے یہ الزامات کبھی عائد نہیں کیے تھے، لیکن اب وہ تکرار، اصرار اور برہمی کے ساتھ اس پر تلے ہوئے تھے۔ بعض امریکی اخبارات نے صوبہ ہلمند کے ایک کمانڈر کو پوست کی کاشت کا ذمے دار قرار دے کر حکمت یار کو اس کے لیے سزا کا مستوجب گردانا۔ وہ کمانڈر واقعی اس میں ملوث تھا، لیکن اس کا گلبدین کی پارٹی سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ دوسری طرف امریکیوں، برطانویوں اور فرانسیسی خفیہ اداروں نے افغانستان کے اندر راستے بنا لیے تھے، اور وہ بعض کمانڈروں سے براہ راست روابط قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

ان کے اپنے لوگوں نے پاکستان کے قبائلی علاقے اور پاکستان میں ہیروئن سازی کی حوصلہ افزائی کی اور کروڑوں کا سرمایہ لگایا تھا۔ منشیات کی تیاری اور سمگلنگ میں ملوث مغربیوں کی تعداد پاکستانیوں اور افغانوں سے دس گنا زیادہ تھی۔ لیکن وہ پاکستانی قوم اور افغانوں کو اس کے لیے ذمے دار قرار دے رہے تھے۔ سب سے بڑھ کر افغان رہنماؤں کو جو منشیات فروشی سے مذہبی جذبے سے نفرت کرتے تھے، امریکیوں نے افغان جنگ میں سعودیوں سے بڑھ کر مالی امداد فراہم نہیں کی تھی، لیکن اب جب فیصلے کا وقت قریب آ رہا تھا تو وہ شائلاک کی طرح ایک پونڈ گوشت کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ستم یہ تھا کہ وزیراعظم جونیجو سمیت پاکستان کی سینئر قیادت حقائق سے بے بہرہ تھی۔ وہ افغانستان میں اس عظیم فتح کی بجائے جو پاکستان کو ایک نئے عہد میں داخل کر دیتی، افغان مسئلے سے جلد از جلد نجات کے آرزومند تھے، جیسے کوئی بے خبر اور بزدل آدمی جھگڑا چکانے کے لیے ہر شرط ماننے پر آمادہ ہو۔ جنرل اختر اور صدر ضیاالحق کا انداز فکر تو یہ تھا کہ افغانستان آزاد ہو جائے اور پاکستان سے اس کے قریبی مراسم قائم ہو سکیں، تو کشمیر کی آزادی کے لیے تحریک اٹھا دی جائے۔ اس اثنا میں خالصتان آزاد ہو اور اس کے ساتھ ہی پاکستان، ایران، آزاد افغانستان اور ترکی پر مشتمل ایک اتحاد تشکیل دینے کے لیے کام شروع کر دیا جائے، جس سے علاقے میں طاقت کا توازن ہمیشہ کے لیے بدل جائے۔ آئی ایس آئی کے صدر دفتر میں آذربائیجان کے آڈیو کیسٹ تیار کیے گئے، جو بارہ سے سولہ سال کے بچوں میں تقسیم کیے گئے۔ روس کی مسلمان ریاستوں میں قرآن مجید کے نسخے اور اس کے تراجم بھجوائے جا رہے تھے۔

صدر ضیاالحق اور جنرل اختر کو یقین تھا کہ ان کی منزل قریب آتی جا رہی ہے، وہ مستقبل کے ایک عظیم اور طاقت ور پاکستان کے تصور میں تھے۔ ایک عظیم فتح کا خواب ان کے دل و دماغ میں جاگزیں تھا۔ ایک نہایت قابل اعتماد اور ناقابل تردید ذریعے کے مطابق 1987ء کے آغاز میں وہ دونوں رہنما میران شاہ کے پاکستانی علاقے سے ملحق افغانستان کے صوبہ خوست گئے، جہاں کچھ عرصہ پہلے روسیوں نے اپنے چھاپہ مار اتارے تھے اور جہاں آٹھ سالہ جنگ کے بعض شدید ترین معرکے رونما ہوئے تھے۔ یہ افغانستان میں مجاہدین کے سب سے بڑے مراکز میں سے تھا، جہاں زیر زمین غاروں میں ہزاروں افراد پناہ لے سکتے تھے۔ اس سفر کا علم دونوں جرنیلوں، ان کے دو راز دار افسروں اور جہاز کے پائلٹ کے سوا کسی کو نہیں تھا۔ وہ ایک ہیلی کاپٹر میں سوار ہو کر یاور مرکز گئے، اور وہاں سے کم از کم ایک گھنٹہ پیدل چلتے ہوئے داغ بیلی کے مورچے میں پہنچے۔ بلندی پر واقع اس مورچے کے سامنے خوست چھاونی اور ہوائی اڈہ تھا، وہاں انہوں نے کچھ وقت گزارا اور لوٹ آئے۔

لافانی مستقبل کے ایک سحر انگیز خواب میں وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت قریب آ گئے تھے، حد درجہ باہمی اعتماد اور کامل آزادی کے ساتھ وہ آنے والے دنوں کو دیکھ رہے تھے، جس کے مطلع سے اہل پاکستان اور اس خطے کے دوسرے مسلمانوں کی عظمت کا ایک نیا دور شروع ہو سکتا تھا۔ آرمی ہاؤس کے عقب میں جہاں صدر ضیاالحق اور ان کا خاندان مقیم تھا، جنرل اختر کے لیے خاص طور پر حاصل کیے گئے گھر میں ان دنوں صدر اور ان کے معتمد

جنرل نے تنہائی میں بہت سی ملاقاتیں کیں۔ صدر صرف اپنے ڈرائیور کو ساتھ لے کر کار میں نکلتے اور جنرل اختر کے ہاں جاتے۔ اس پر سیکورٹی حکام نے کئی بار تشویش کا اظہار کیا، جب پریشانی کے عالم میں صدر سے کہا جاتا کہ یہ حفاظتی اقدامات کے تقاضوں سے صریح انحراف ہے تو وہ کبھی سنجیدگی سے اور کبھی ہنستے ہوئے کہتے

Dont worry I am in safe hands .

(فکر نہ کیجئے، میں محفوظ ہاتھوں میں ہوں۔)

بعض دوسرے اعلیٰ حکام کی طرح صدر اور جنرل اختر کے درمیان خفیہ رابطے کے لیے ہاٹ لائن تو موجود ہی تھی، لیکن اس سے ہمیشہ استفادہ نہیں کیا جاتا تھا۔ جب کبھی کوئی فیصلہ درپیش ہوتا تو وہ مل بیٹھتے، اور اس وقت وہ چھت کے نیچے گفتگو نہیں کرتے تھے۔

جنرل اختر کی میز کے دراز میں ایک چھوٹی سی ڈائری رکھی رہتی، جس پر وہ صدر سے گفتگو کے لیے ضروری نکات درج کرتے رہتے۔ اگر ان کے درمیان تنہائی کی ملاقات کا موقع نہ آتا یا خاص طور پر اس کی ضرورت محسوس نہ کی جاتی تو وہ جمعہ کی نماز کے لیے آرمی ہاوس کی مختصر سی مسجد میں ملتے۔ نماز کے بعد وہ مسجد کے قریب ایک چھوٹے سے درخت کے نیچے کھڑے ہو جاتے۔ جنرل اختر اپنی جیب سے ڈائری نکالتے اور صدر کے سامنے اپنی معروضات پیش کر دیتے۔ وہ ان میں سے بعض نکات کی وضاحت کرتے، بعض اقدامات پر حکم دیتے اور بعض پر بعد ازاں گفتگو کے لیے کہتے۔ مارچ 1987ء میں جنرل اختر آئی ایس آئی سے الگ ہو گئے، لیکن یہ معمول اس کے بعد بھی جاری رہا۔ آئی ایس آئی سے جدا ہونے کے بعد بھی وہ افغان سیل کے ممبر تھے اور اب بھی ان کی رائے کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ اگرچہ اب وہ فیصلہ صادر کرنے اور ترجیحات طے کرنے والے آدمی نہیں تھے۔

روسی افغانستان میں کوئی اور ادارہ توڈھنگ سے تعمیر نہ کر پائے، حتیٰ کہ افغان فوج میں بھی فرار اور بغاوت کا سلسلہ جاری رہا، جس پر انہوں نے اس قدر توجہ مبذول کر رکھی تھی لیکن وہ ستر ہزار افراد پر مشتمل خفیہ پولیس خاد کی تشکیل میں ضرور کامیاب رہے اور اسے اب وزارت کی سطح پر ترقی دے کر ''واد'' (وزارت اطلاعات دولتی) کا نام دے دیا گیا۔ 1980ء میں طے پانے والے ایک معاہدے کے تحت ''واد'' کے بیشتر کارکنوں نے ماسکو کے، کے جی بی سکول میں تربیت پائی۔ پاکستان میں واد کی سرگرمیاں کے جی بی کی نگرانی میں بروئے کار آ رہی تھیں۔ تخریب کاری کے لیے جس کا صدر دفتر کراچی میں تھا، پاکستان میں اپنے حامی ''ترقی پسند'' کارندوں کی مدد سے کے جی بی کے پاس پاکستانی شخصیتوں، اداروں، علاقوں، جماعتوں اور آبادیوں کے بارے میں وسیع معلومات کا ایک ذخیرہ موجود تھا، جسے از سر نو مرتب کرنے کا عمل جاری رہتا تھا۔ پاک افغان سرحد کی مخصوص صورت حال نے ''واد'' کے لیے کام کرنے میں آسانیاں پیدا کیں، جبکہ اس کے بعض ایجنٹ مہاجر کیمپوں میں داخل ہونے اور افغان پارٹیوں کے کارڈ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ کراچی میں سوویت کلچرل سنٹر ''واد'' کے کارندوں کو پاکستانی طالب علموں سے رابطے کے مواقع فراہم کرتا، نمایشوں اور برسیوں کی تقریبات بھی ایسے روابط کے لیے استعمال کی جاتیں۔ 1987ء میں کراچی میں ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس سے ''واد'' کے ایجنٹوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ حالت جنگ میں ہونے کے باوجود، پاکستان نے افغانستان کی انتظامیہ کو کراچی کی بندرگاہ کے راستے تجارت کی اجازت دے رکھی تھی کہ پابندی کی صورت میں افغان عوام مشکلات کا شکار ہوتے۔ کراچی میں افغان ٹریڈ کمشنر کا دفتر بھی ''واد'' کی سرگرمیوں کے لیے استعمال ہو رہا تھا۔ بائیں بازو کے پانچ سیاست دانوں کی مدد سے سرحد اور بلوچستان سے ہر سال ہزاروں پاکستانی طلبہ کو روس پہنچایا جاتا، جہاں وہ مفت تعلیم اور وظائف حاصل کر سکتے تھے۔ ''واد'' نے ڈیورنڈ لائن کے قریبی علاقوں میں دہشت گردی کے سیل قائم کیے۔ افغان جہاد شروع ہونے کے بعد سے اس نے پاکستان مین

تخریب کاری کا آغاز کر دیا، لیکن 1987ء میں بتدریج اس کی سرگرمیاں بہت زور پکڑ گئیں۔ اب اس عمل میں اسے بھارتی ایجنسی ''را'' کی مدد بھی حاصل تھی، جو سندھ میں پہلے سے سرگرم عمل تھی، لیکن بھارتی پنجاب کی بگڑتی صورت حال کے بعد، اس نے پاکستان کے دوسرے حصوں میں بھی ایجنٹوں کا زیادہ وسیع جال پھیلانا شروع کر دیا اور 1988ء تک پہنچتے پہنچتے اس کی تنظیم بے حد موثر ہوگئی۔ 1987ء پاکستان میں تخریب کاری کے واقعات کا سال تھا۔ پشاور، کراچی، راولپنڈی اور لاہور کے اندوہناک واقعات سے ہزاروں پاکستانی ہلاک ہوگئے۔ اس قوم میں جسے جنگ اور تباہی کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ کیا گیا تھا، اس سے جو خوف و ہراس پیدا ہوا، سیاستدانوں نے اسے حکومت اور خاص طور پر صدر ضیاالحق کے خلاف نفرت پھیلانے کے لیے استعمال کیا۔ ہر حادثے کے لیے وہ انہیں ذمے دار قرار دیتے اور ان میں سے بعض افغان مجاہدین کو۔ وہ یہ بات ماننے کے لیے آمادہ نہ تھے کہ افغان حریت پسند پاکستان کی مدد سے نہ صرف آزادی، بلکہ پاکستان کی بقا کی جنگ بھی لڑ رہے ہیں۔

1988ء کے آغاز میں گورباچوف اور رونالڈ ریگن میں افغانستان پر ایک خاموش مفاہمت ہوگئی۔ بظاہر دونوں بڑے ملک اس پر متفق ہوگئے کہ روسی افواج افغانستان سے نکل جائیں گی اور اس عمل میں امریکہ اس حد تک تعاون کرے گا کہ یہ ایک توہین آمیز شکست دکھائی نہ دے۔ غالباً ان کے درمیان اس پر بھی اتفاق رائے ہوگیا کہ افغانستان میں ان خطرناک ''بنیاد پرستوں'' کی حکومت نہ بننے دی جائے، جن کے بھائی بند ایران میں ''لاشرقیہ ولاغربیہ'' کا نعرہ بلند کر رہے تھے۔

گورباچوف نے اعلان کر دیا کہ جینیوا معاہدے پر دستخط ہوں یا نہ ہوں، روسی فوجی افغانستان سے واپس چلے جائیں گے۔ ادھر صدر ضیاالحق کی سرتوڑ کوششوں کے نتیجے میں افغان لیڈر اس پر آمادہ ہوگئے کہ وہ کابل کے ایسے ''اچھے'' مسلمانوں کو عبوری حکومت میں شامل کر سکتے ہیں، جو جہاد میں تو شریک نہیں ہوئے، لیکن کابل کی کٹھ پتلی انتظامیہ کے مہرے نہ تھے۔ جینیوا میں مذاکرات کا آخری دور شروع ہونے والا تھا۔ وزیر خارجہ صاحب زادہ یعقوب علی خاں اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو میں انتخاب ہارنے کے بعد وزارت خارجہ سے الگ کر دیے گئے، اور اب کراچی سے زین نورانی، جنہوں نے امور خارجہ کے وزیر مملکت کی حیثیت سے اڑھائی سال تربیت حاصل کی تھی، جونیجو کے وزیر خارجہ بن چکے تھے۔ صدر ضیاالحق اس پر اڑے ہوئے تھے کہ روس پر دباؤ ڈال کر امریکہ اور آزاد دنیا کی تائید حاصل کر کے کابل میں ایک ایسی حکومت قائم کر دی جائے، جس میں اصل قوت آزادی کے لیے ایک عشرے کی تاریخی جدوجہد کرنے والے پاکستان دوست افغان مجاہدین کے ہاتھ میں ہو۔

یکا یک راولپنڈی اور اسلام آباد کے در و دیوار اوجڑی کیمپ میں دھماکوں سے لرز اٹھے، جبکہ صدر اور وزیر اعظم دونوں ملک سے باہر تھے۔ جوائنٹ چیفس آف کمیٹی کے چیئرمین جنرل اختر کو اس معاملے سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا، لیکن انہوں نے آگے بڑھ کر معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ آئی ایس آئی کی سربراہی کے دور میں، وہ ہفتے میں دو بار اس کیمپ میں جاتے رہے تھے۔ انہوں نے غیر معمولی حفاظتی اقدامات کر رکھے تھے، اور کوئی دوسرا تو کیا، فوج کے جرنیل بھی اس کے وجود سے بے خبر تھے۔ تاہم بعد ازاں اس غیر معمولی راز داری کا اہتمام نہ ہو سکا اور دشمن اس تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ بظاہر محسوس کیا گیا کہ روسیوں کی پسپائی کے تصور سے خوف زدہ ''واذ'' کی کارروائی ہے، لیکن بعض دوسرے باخبر ماہرین کو اب بھی اصرار ہے کہ یہ خود اسلحہ فراہم کرنے والی سی آئی اے کا کارنامہ تھا، جسے اب آئی ایس آئی کا وجود ناگوار تھا۔ اس وقت جب امریکی ماہرین کی ایک ٹیم، جس کے ارکان نیکریں پہن کر کیمپ میں داخل ہوئے، یہ تجویز کر رہی تھی کہ اسلام آباد اور راولپنڈی کو آبادی سے خالی کرا لیا جائے، جنرل اختر کے حکم پر فوجی جوان قطاریں باندھ کر کیمپ میں داخل ہوئے اور اپنے ہاتھوں میں باقی ماندہ بم اور دوسرا اسلحہ شہر سے باہر اٹھا لے گئے۔ غیر ملکی دورے سے واپسی پر وزیر اعظم جونیجو نے اعلان کیا کہ اس سانحہ کی تحقیقات کرائی جائے گی، اور ذمے دار افراد کے خلاف کارروائی کی جائے گی۔ (کچھ دن بعد

بھارت کے ایک اسلحہ ڈپو میں بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا، لیکن وہاں کسی جرنیل کے خلاف کوئی کارروائی نہ ہوئی۔)

صدر ضیاالحق نے وطن واپسی پر جنرل اختر عبدالرحمٰن کو ایک خط لکھا اور اس میں اوجڑی کیمپ کے حادثہ کے بعد صورتحال کو سنبھالنے کے لیے ان کی خدمات کی تعریف کی۔ وزیراعظم جونیجو نے کابینہ کے پانچ ارکان ابراہیم بلوچ، رانا نعیم، قاضی عابد، اسلم خٹک، اور نسیم آہیر پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کر دی۔ کمیٹی کی رپورٹ کا ملخص یہ تھا کہ یہ دشمن کی کارروائی ہے اور یہ کہ اگر کوئی شخص غفلت کا مرتکب ہوا تو اس کے خلاف فوجی ضابطوں کے مطابق کارروائی کی جاسکتی ہے۔ کمیٹی کے ارکان اس وقت ہکا بکا رہ گئے، جب ایک رکن رانا نعیم نے اصل رپورٹ میں تبدیلیاں کر کے ایک دوسری رپورٹ مرتب کی۔ اس پر کمیٹی کے صرف تین ارکان کے دستخط دکھائے گئے تھے، جبکہ اسلم خٹک اور نسیم آہیر کے دستخط موجود نہ تھے۔ باقی دو ارکان نے حلفیہ طور پر کہا کہ ان کے دستخط جعلی ہیں۔ صرف ایک رکن اس رپورٹ کے مستند اور باضابطہ ہونے پر اصرار کر رہے تھے۔ وہ پیپلز پارٹی کی سربراہ بے نظیر بھٹو سے جا کر ملے اور ان کی یہ تصویر محکمہ اطلاعات نے سرکاری طور پر اخبارات کو جاری کی، جس میں وہ مذاکرات کرنے والے کی بجائے ایک خبر رساں کا چہرہ لیے بیٹھے تھے۔ صدر کی شہادت کے بعد وہ اچک کر پیپلز پارٹی کی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ جونیجو کابینہ کے ایک وزیر کھلے عام کہتے پھر رہے تھے کہ جنرل اختر اور بعض دوسرے لوگوں کو ان کے مناصب سے برطرف کر دیا جانا چاہیے۔ کیا اس خیال کو وزیراعظم کی تائید حاصل تھی؟ اور کیا انہیں معلوم نہیں تھا کہ جنرل اختر کو آئی ایس آئی سے الگ ہوئے ایک سال گزر چکا ہے۔

جینوا مذاکرات کے حوالے سے صدر اور وزیراعظم کے طرز فکر میں، پہلے ہی طویل فاصلہ حائل ہو چکا تھا۔ وزیراعظم نے راولپنڈی میں سیاسی جماعتوں کی گول میز کانفرنس طلب کر لی، بائیں بازو کی جماعتیں اور پیپلز پارٹی جو کل تک حکومت سے کسی رابطے کی روادار نہ تھیں، کسی پیشگی شرط کے بغیر اس کانفرنس میں شرکت پر آمادہ ہو گئیں۔ اور انہوں نے جینوا معاہدے پر دستخط کرنے کی حمایت کر دی۔ اس وقت صدر پورے وثوق سے یہ سمجھتے تھے کہ اگر پاکستان ڈٹا رہا تو روس اور امریکہ کے لیے افغانستان میں عبوری حکومت کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے گا۔ گول میز کانفرنس کے پہلے دن کے اختتام پر، انہوں نے کابینہ کے ارکان سے ملاقات کی، ایسی شدت کے ساتھ، جو ان کے مزاج سے لگا نہیں کھاتی تھی۔ انہوں نے جونیجو اور ان کے ساتھیوں کو سمجھانے کی کوشش کی، کہ اگر انہوں نے شرائط منوائے بغیر معاہدے پر دستخط کر دیے تو وہ ایک تاریخی موقع کھو دیں گے۔ وزیر مملکت زین نورانی کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے کہا، ''اگر آپ نے معاہدے پر دستخط کیے تو پاکستانی عوام آپ کی بوٹیاں نوچ لیں گے۔'' لیکن نورانی خوب جانتے تھے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ پاکستانی عوام سمجھ ہی نہیں پائیں گے کہ ان کے ساتھ کیا بیت گئی ہے۔

کچھ دن بعد مسلم لیگی ارکان پارلیمنٹ کے ایک اجلاس میں جو انہیں تاریخی صورت حال کے بارے میں آگاہ کرنے کے لیے بلایا گیا تھا، صدر نے ذاتی طور پر شرکت کی درخواست کی۔ صدر کا انداز فکر یہ تھا کہ انہیں غلط تناظر میں معلومات فراہم کر کے کسی فیصلے کی توثیق سے پہلے وہ اپنے موقف سے آگاہ کر دیں۔ اس اجلاس میں وزیراعظم نے اس انداز سے صدر کو خطاب کرنے کی دعوت دی، گویا اس کی کوئی ضرورت تو نہ تھی، لیکن چونکہ یہ صدر کی خواہش ہے، لہذا انہیں بھی سن لیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی سرکاری ذرائع ابلاغ کے نمایندوں کو حکم دیا گیا کہ وہ صدر کی یہ تقریر ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات کے لیے جاری نہیں کی جائے گی۔ اجلاس کے ان شرکاء نے جو سٹیج کے قریب تھے، صدر کے ہاتھوں کو جذبات کی شدت سے لرزتے دیکھا، لیکن انہیں اپنے چہرے اور جذبات پر اب بھی قابو تھا۔

14 اپریل 1988ء کو جینوا میں ایک معاہدے پر دستخط کر دیے گئے، جس کے تحت روسی افواج کو فروری 1989ء تک افغانستان سے نکل جانا تھا۔ معاہدے پر پاکستان، اور افغانستان کی کابل انتظامیہ کے علاوہ امریکہ نے ضامن کی حیثیت سے دستخط ثبت کیے۔ ٹھیک 40 دن بعد وزیراعظم

محمد خان جونیجو کی حکومت اور اسمبلیاں اس وقت برطرف کر دی گئیں، جب وہ شرق اوسط کے دورے سے لوٹ کر آئے تھے۔ صدر نے اس حکم سے پہلے کسی سے صلاح مشورہ نہیں کیا۔ ہنگامی پریس کانفرنس کے لیے اپنا بیان انہوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا اور اسے ٹائپ کرانے سے گریز کیا۔ پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے صدر کے لہجے میں وہ اعتماد نہیں تھا، جس کے لیے وہ سالہا سال سے پہچانے جاتے تھے۔ لیکن یہ تو پوری طرح واضح تھا کہ وہ اپنی جنگ تنہا لڑنے کا فیصلہ کر چکے تھے، تمام سیاسی جماعتوں اور پریشر گروپوں سے الگ، اپنے غیر ملکی حلیفوں سے دور۔